نبوّت کی ضرورت

(۳)

عبدالحمید صدیقی

گذشتہ اشاعتوں میں ہم نے تصوّف، اُس کی ماہیّت اور اُس کی کمزوریوں پر بحث کی تھی۔ اور بتایا تھا کہ انسان کی قلبی واردات اور داخلی کیفیات خواہ وہ کتنی ہی قیمتی اور قابل قدر ہوں اور انسان کے نہایت ہی اعلیٰ و ارفع احساسات کی ترجمان، لیکن اُن میں بہرحال یہ صلاحیت موجود نہیں کہ وہ انسان کی زندگی کے سارے شعبوں میں مکمّل رہنمائی دے سکیں۔ ان کیفیات سے انسان ایک روحانی کیف اور سرور تو بلاشبہ حاصل کرتا ہے لیکن انہیں انسان کی اجتماعی زندگی کی کبھی اساس نہیں بنایا جاسکتا۔ انسان کی خارجی زندگی میں یہ نفسی تجربات کچھ زیادہ مؤثر ثابت نہیں ہوتے، ان سے کسی تہذیب اور کسی تمدّن کی تشکیل نہیں کی جاسکتی۔

انسان کی حیات اجتماعی اور اُس کے مسائل بھی چونکہ اس عالم کے نہایت ہی ٹھوس حقائق ہیں، جن سے انسان بحیثیت انسان صرفِ نظر نہیں کرسکتا۔ اس لئے تاریخ کے کسی دَور میں کسی قوم اور ملّت نے تصوّف کو اجتماعی ضابطہ حیات کی حیثیت سے نہیں اپنایا اس نے انسانوں کے اندر ہمیشہ انفرادیت کی پرورش کی۔

متصوفین نے نوعِ انسانی کی جس انداز سے خدمت سرانجام دی اس میں اختلاف کی پوری گنجائش ہے لیکن ان حضرات کے بارے میں ایک بات قدرے وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ انہیں اپنی حدود کا پورا پورا احساس تھا اور اُنہوں نے اُن دائروں میں کبھی قدم رکھنے کی کوشش نہیں کی جنہیں وہ تصوف کی حدود سے خارج سمجھتے تھے۔ اُنہوں نے بڑے واشگاف الفاظ میں یہ کہا کہ اُن کا کام صرف اسی قدر ہے کہ حق کے طلبگاروں میں ذاتِ حق کا صحیح شعور و ادراک پیدا کریں اور انسان کے جو داعیات اس راہ میں مزاحم ہوں اُن سے انہیں نجات دلائیں۔ اس ایک دعویٰ کے علاوہ متصوفین نے کبھی کوئی اور دعویٰ نہیں کیا۔ اُنہوں نے اپنی

حدود کو پوری طرح ملحوظ خاطر رکھا۔

انسان کی رُشد و ہدایت کے لیے اب جو نئے دعویدار سائنس دانوں کی صورت میں نمودار ہوئے ہیں اُن کے دعاوی متصوفین کے مقابلے میں کہیں زیادہ بلند ہیں۔ اور وہ اپنی فطری حدود کو نظرانداز کر کے اُن رفعتوں تک پہنچنے کا داعیہ رکھتے ہیں جو فطرتاً اُن کے حدِ ادراک سے ماوراء ہیں۔ غلط اندازِ فکر نے اُن کے اندر ایک قسم کی جسارت پیدا کر دی ہے اور وہ حقائق سے یکسر صرفِ نظر کرتے ہوئے انسان کی پوری زندگی کے لئے ہدایت و رہنمائی کے مدعی ہیں۔

ان صفحات میں ہم سائنس دانوں کے اسی دعویٰ کے متعلق چند گذارشات پیش کریں گے۔ سائنس لاطینی زبان کے لفظ (SCINTIA) سے مشتق ہے جو لفظ علم کے ہم معنی ہے۔ ازمنہ وسطیٰ میں اس لفظ کا علم کے ہر شعبہ میں اطلاق ہوتا تھا لیکن ہمارے اس دَور میں سائنس سے مراد وہ مخصوص علم ہے جس کی بنیاد تجربہ اور مشاہدہ ہو اور جو عالم محسوسات کے حقائق کو علّت و معلول کی کڑیوں میں اس انداز سے جوڑے کہ اُن سے نتائج بآسانی اخذ کئے جا سکیں۔ ایسے نتائج جن کی افادیت اور قدر و قیمت تجربہ کی میزان پر تول کر معلوم ہو جائے۔

انسان کے لئے صحیح ضابطہ حیات مہیا کرنے میں سائنس کی بیچارگی اور درماندگی پر بحث کرنے سے پیشتر یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم ایک نظر اُن اسباب پر بھی ڈال لیں جنہوں نے سائنس کو دورِ جدید میں غیر معمولی اہمیّت دی ہے۔

انسان اپنی فطرت کے اعتبار سے اس بات پر مجبور ہے کہ وہ اپنے گرد و پیش پھیلی ہوئی وسیع کائنات کے رنگا رنگ مظاہر کا نہ صرف مشاہدہ کرے بلکہ اُن کے درمیان ہم آہنگی بھی تلاش کرے ــــ وہ جب تک اُن کے مابین ایک فطری ربط کا پتہ نہیں لگا لیتا اُس کا مشاہدہ فطرت نا تمام رہتا ہے۔ جس طرح ایک متصوّف گیان اور دھیان کی مدد سے ایک وقتی کیف اور سرور حاصل کرتا ہے اور اگر مذہب اُس کی معاونت اور دستگیری نہ کرے تو وہ اس عارضی سرور کی منزل سے گزر کر حقیقت کو پانے سے یکسر قاصر رہتا ہے بالکل اسی طرح اگر مشاہدہ کائنات کے پیچھے اُس حقیقت کبریٰ کی تلاش و جستجو کا جذبہ صادق کارفرما نہ ہو، جو اس نظام تکوینی کی فی الواقع علّت غائی ہے تو وہ بھی اسی کائنات کے وسیع اور پیچیدہ طلسم میں اُلجھ کر رہ جاتا ہے اور حقیقت تک

پہنچ نہیں پاتا۔

اسرارِ کائنات کے متعلق عقل و فکر کی یہ بے چینی جو آگے چل کر عقیدہ اور ایمان پر منتج ہوتی ہے اور جس کے سمجھنے سے انسان نہ صرف خالق کا ادراک کرتا ہے بلکہ خود اپنے آپ کو بھی پہچاننے میں کامیاب ہوتا ہے انسانی فطرت کا سب سے اہم خاصہ ہے

لالہ و گل کہاں سے آئے ہیں ابر کیا چیز ہے، ہوا کیا ہے

یہ دورِ جدید کے انسان کے لئے ہی وجہ اضطراب نہیں بلکہ عہدِ ماضی کے انسانوں کے لئے بھی ایک راز تک جس پر سے پردہ اُٹھانے کے لئے اُن کا ذہن ہمیشہ بے تاب رہا۔ نظام تکوینی کو سمجھنے کے لئے دونوں ایک ہی طرح بے چین ہیں لیکن آج کے انسان اور ماضی کے انسان میں اس اتفاق و اتحاد کے باوجود ایک نمایاں فرق یہ ہے کہ عہدِ ماضی کا انسان چونکہ اس کائنات کو کوئی اتفاقی حادثہ نہ سمجھتا تھا بلکہ وہ اسے ایک قادرِ مطلق اور مدبّر ذات کی تدبیر کی کرشمہ سازی خیال کرتا تھا۔ اس لئے وہ جب کبھی بھی کائنات کا مطالعہ کرتا تو وہ اس میں خالق کائنات کی حکمت اور دانائی کا کھوج لگانے کی کوشش کرتا۔ اُس کا دل بیتاب کائنات کے خارجی مظاہر کے مشاہدہ پر مطمئن نہ ہوتا .... بلکہ وہ اس کائنات کے ظاہری پردوں کے پیچھے جھانک کر اُس حقیقتِ کبریٰ کو جاننے کی سعی کرتا جس کو جانے اور مانے بغیر خود اُس کا وجودِ ہستی کی وسعتوں میں بے معنی سا ہو کر رہ جاتا ہے۔ محدود اور لامتناہی سے اُسے گوناگوں دلچسپی تھی اور وہ اس پر بار بار نگاہ ڈالتا۔ لیکن اُس کے فکر و نظر نے کبھی اسے اپنی پرواز کی آخری حد تسلیم نہ کیا۔ اس کی حیثیت اُس کے نزدیک ہمیشہ نشان منزل کی رہی اور یہ کائنات کبھی اُس کی منزلِ مقصود نہ بننے پائی۔ اُس نے گہرے اضطراب کے ساتھ اس محسوس اور محدود دُنیا سے گزر کر اُس غیر محدود اور لامتناہی کو سمجھنے کے لئے جد و جہد کی جس میں وہ تمام اوصاف عالیہ بدرجہ اتم موجود ہوں جنہیں وہ اپنی ذات میں پیدا کرنے کا آرزومند ہے اور جس کی بدولت اُسے یقین و ایمان کی لافانی دولت ہاتھ آتی ہے۔ جو اس کی خودی کی ترقی کی ضامن ہے۔

قدیم انسان کے برعکس عہدِ حاضر کے انسان نے جس وقت مظاہرِ قدرت کا مطالعہ شروع کیا اُس وقت چونکہ اُس پر سے مذہب کی گرفت ڈھیلی ہو چکی تھی اس لئے اُس کے دل میں غیر محدود کو سمجھنے کی لگن

بھی کافی حد تک کم ہو گئی اور اس وجہ سے اُس کی نظر برق و بخارات کی حد تک سے آگے نہ بڑھنے پائی۔ اس کا ذہن اسی مادی دُنیا کے خم و پیچ ہی میں اُلجھ کر رہ گیا۔ اور اُس کے اندر کبھی یہ احساس نہ پیدا ہوا کہ وہ اس طلسم ہوش رُبا کی گرفت سے نکل کر حقیقت کا ادراک کرے۔

قدیم اور جدید انسان کے درمیان فکر و نظر کے اس اساسی اختلاف کی وجہ سے سائنس کے بارے میں اُن کا طرزِ عمل ایک دوسرے سے بُنیادی طور پر مختلف رہا ہے۔ ماضی کی بے شمار قوموں، خصوصاً ملّتِ اسلامیہ نے مظاہرِ کائنات کا بڑے گہرے جذبہ کے ساتھ مطالعہ اور مشاہدہ کیا۔ اور پھر اس مطالعہ کی مدد سے اُن قوتوں کو غلام بنایا جو انسان کی خدمت اور چاکری کے لئے پیدا کی گئی ہیں۔ لیکن مظاہرِ قُدرت کے ساتھ اس گہرے شغف کے باوجود اُنہوں نے کبھی بھی انہیں مقصود و مطلوب بنانے کی حماقت نہ کی۔

مغربی انسان چونکہ ایمان جیسی نعمت سے محروم ہو چکا ہے اس لئے اُس نے اس مادی کائنات کو ہی منزلِ مقصود سمجھ کر اُس کے ساتھ عبودیّت کا تعلق استوار کر لیا ہے۔ فطرت کی یہ ساری رنگا رنگی، بہتے ہوئے دریا، لہلہاتا ہُوا سبزہ، کوہ و صحرا، غنچہ و گُل، اور ماہ و انجم جدید انسان کے لئے معرفت کردگار کا ذریعہ نہیں بلکہ ایک اندھے بہرے لزوم کے وجود پر دلالت کرتے ہیں۔ اُن کے نزدیک اس کائنات میں کوئی منصوبہ اور نظم نہیں۔ یہاں کسی مدبّر کا ارادہ و تدبیر کارفرما نظر نہیں آتی۔ بلکہ اس کائنات میں جو کچھ موجود ہے وہ محض بخت و اتفاق سے طبیعی اور کیمیاوی قوتوں کے تعامل سے معرضِ وجود میں آ گیا ہے۔

دنیا کا کوئی گروہ اگر نشانِ منزل کو ہی منزلِ مقصود سمجھ لے تو اُس سے زیادہ گم کردہ راہ اور کون ہو سکتا ہے۔ یہی حال آجکل اہلِ مغرب کا ہے۔ علومِ طبیعی جن کا مقصد انسانی عقل و بصیرت کو اُس کی فطری حدود سے آگاہ کر کے اُسے کائنات کی سب سے بڑی حقیقت سے لذّت آشنا کرنا تھا، وہ خود معرفتِ حق کی راہ میں زبردست رکاوٹ ثابت ہو رہے ہیں۔ . . . .

. . . . اُنہوں نے بدقسمتی سے انسان کی فکری صلاحیتوں کو اس حد تک مفلوج کر دیا ہے کہ وہ حواس کی گرفت سے آزاد نہیں ہونے پاتیں اور اگر اُن کے اندر کبھی تحریک پیدا بھی ہوتی ہے تو وہ انہیں کے قفس میں پھڑپھڑا کر جان دے دیتی ہیں۔ اہلِ مغرب نے ان علوم کے گرد و پیش تعصّب اور تنگ نظری کے

ایسے مضبوط حصار قائم کر رکھے ہیں۔ کہ جن سے نکلنا اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہو گیا ہے۔

فکر و نظر کی اس کجی کی وجہ سے جدید انسان اُس توازن کو اپنے ہاتھ سے کھو بیٹھا ہے جو علوم طبیعی کے مطالعہ میں صاحب ایمان قوم نے ہمیشہ اپنے پیشِ نظر رکھا۔ انسان کے شعور و احساس سے جب ایک غیر محدود اور لامتناہی ذات سے محبّت رخصت ہوئی تو پھر انسان نے اس مادی دنیا اور اس کی قوتوں پر اندھا دھند اعتماد کرنا شروع کیا۔ کسی بلند و بالا ہستی پر ایمان چونکہ انسان کا ایک فطری مطالبہ ہے۔ جس سے وہ کبھی صرف نظر نہیں کر سکتا۔ اُس کے دل میں جب کبھی بھی ایمان کا خلا پیدا ہو گا تو وہ اس خلا کو جلد از جلد کسی دوسری ذات یا قوت کے ساتھ غیر معمولی عقیدت کا رشتہ اُستوار کر کے پُر کرنے کی کوشش کرے گا۔ انسان جس طرح خلا میں چند لمحوں کے لئے زندہ نہیں رہ سکتا اور وہ اس کمی کو فوراً مصنوعی طریقوں سے پورا کرنے کی کوشش کرتا ہے بالکل اسی طرح وہ ایمان کے بغیر چند لمحات بھی گذارنے کی ہمت و طاقت نہیں رکھتا اور فکر و احساس کے خلا کو مظاہر قدرت اور توانائی پر اعتماد کر کے پُر کرتا ہے۔ ایمان اُس کی طبیعت کا بنیادی تقاضا ہے وہ اس تقاضے کو اگر چاہے تو کائنات کی سب سے واضح اور سب سے بڑی حقیقت پر ایمان لا کر پورا کرے اور چاہے تو اس کارخانہ قُدرت کے کسی کل پُرزے کو ہی اپنا معبود سمجھ بیٹھے۔ معبود ماننے بغیر کوئی چارہ نہیں۔ چنانچہ جدید انسان نے خدائے برتر کی غلامی کا جُوا تو اپنے کندھوں سے اُتار پھینکا ہے اور اُس کی جگہ علوم طبیعی کی محبت اور عقیدت میں اپنے آپ کو گرفتار کر لیا ہے۔ اب یہی علوم اُس کے فکر کی آخری پرواز ہیں۔ ان سے ماوراء اسے کوئی چیز نظر نہیں آتی۔ اُس کا اب اس بات پر پختہ یقین ہو چکا ہے کہ دُنیا میں جو کچھ موجود ہے وہ مادہ ہی کی کرشمہ سازیاں ہیں۔ کائنات اپنے وجود کے لئے اسی کی رہینِ منت ہے۔ قلب و ضمیر، فکر و احساس سب اسی کی ترقی یافتہ صورتیں ہیں۔

کائنات اور خالق کائنات کے متعلق یہ غیر حقیقت پسندانہ طرزِ فکر یورپ کے اندر کچھ یونہی پیدا نہیں ہو گیا۔ اس کے پیچھے بعض اسباب کام کر رہے تھے۔ ان میں ایک بڑا سبب مسیحیت کی ناکامی اور مسیحی علماء کی تنگ نظری اور تعصّب تھا۔ دُنیائے مغرب میں جب نشاۃ ثانیہ کی تحریک شروع ہوئی

اور وہاں کے رہنے والوں نے فکر و احساس کی انگڑائی لی تو انہیں پہلے قدم پر جس گروہ سے سابقہ پیش آیا وہ تنگ نظر پادریوں کا گروہ تھا۔ اس گروہ نے اس تحریک کا نہایت غلط انداز سے راستہ روکنا چاہا، اور ظلم و استبداد کے ذریعہ اس تحریک کے علمبرداروں کچلنے کی کوشش کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ چِڑ اور ضد میں آکر ان لوگوں نے مذہب کے خلاف ہی بغاوت کر دی۔ اُنہوں نے کائنات کی بدیہی شہادتوں کے باوجود زندگی کی ساری عمارت کو الحاد کی بنیادوں پر استوار کیا۔ اور بڑے زور کے ساتھ اس امر کا اعلان کیا کہ اس مادی کائنات کے سوا دنیا میں کوئی چیز نہیں۔ اس کے پیچھے کسی مدبّر کی تدبیر کام نہیں کر رہی۔ یہاں کسی بلند و بالا ذات کا ارادہ کارفرما نہیں۔ اس کائنات کا کوئی خالق اور مالک نہیں، انسان کسی آسمانی ہدایت کا محتاج نہیں۔ اور یہاں کوئی واجب الاطاعت نظام اخلاق نہیں۔ یہ تھا وہ انداز فکر جس کے مطابق یورپ کا رُخ ایک مکمل اور وسیع مادیت کی طرف پھر گیا۔ خیالات، نقطۂ نظر، نفسیات و ذہنیت، اخلاق و اجتماع، علم و ادب، حکومت و سیاست، غرض زندگی کے تمام شعبوں میں الحاد پوری طرح غالب آگیا۔ اگرچہ یہ سب کچھ تدریجی طور پر ہوا اور ابتداء میں تو اس کی رفتار بہت سست تھی لیکن آہستہ آہستہ اس طوفان نے سارے یورپ کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

سائنس دان ان علوم طبیعی کے بارے میں جو بلند بانگ دعاوی چاہیں کرتے رہے لیکن یہ حقیقت اب واضح ہو کر سامنے آچکی ہے کہ سائنس انسان کے لئے صحیح ضابطہ حیات فراہم کرنا تو ایک طرف خود محسوسات اور مشاہدات کی دنیا کے بہت سے مسائل حل کرنے سے عاجز ہے۔ مثال کے طور پر وہ ابھی تک اس اُلجھن کو سلجھانے سے قاصر ہے کہ اگر اس کائنات کو غیر معین توانائی کا نتیجہ مان لیا جائے تو پھر اس کے بطن سے معین مظاہر کیسے پیدا ہو گئے۔ یہ تنوع، کثرت و تعدد کیا ہیں۔ اگر یہ سب کارخانہ بے مقصد ہے تو پھر بے منصوبہ عمل سے نظم و ربط کیسے ظاہر ہو گئے۔ ارتقاء کے میکانکی لزوم نے شعور و آگہی کو کیونکر جنم دیا؟ پھر خود شعور اس توانائی سے کیونکر مختلف ہو گیا جس سے وہ کہا جاتا ہے کہ وہ پیدا کیا گیا ہے۔ لیکن چونکہ اس وقت یہ موضوع ہمارے پیش نظر نہیں اس لئے ہم اسے نظر انداز کر کے اصل مقصد کی طرف بڑھتے ہیں۔

انسان خواہ کسی عہد اور ملک کا ہو، اُس کا تعلق کسی طرزِ فکر سے ہو، وہ خدا پرست ہو یا قوم پرست، آتش پرست ہو یا بتوں کا پجاری، خالق کو ماننے والا ہو یا اس کے وجود سے انکار کرنے والا، اُس کے اندر بعض فطری سوالات کو سمجھنے کی لگن بہرحال موجود رہتی ہے۔ مثلاً اُس کا دل بے تاب اس امر کو جاننے کی ہمیشہ کوشش کرتا ہے اس عالم رنگ و بو کا آغاز کیا ہے اور اس کا آخری انجام کیا ہوگا۔ اس کارخانہ قدرت میں اس کی حیثیت کیا ہے اور اُسے کس مقصد کی تکمیل کی خاطر معرضِ وجود میں لایا گیا ہے۔ اس کائنات کے خالق خواہ وہ مادہ ہی ہو، اُس سے اُس کے تعلق کی کیا نوعیت ہونی چاہئے؟ انسان جب تک وہ انسان ہے فطرت انسانی کے ان بنیادی سوالات کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔ یہ ہمیشہ اُس کے لئے وجہ اضطراب رہے ہیں۔ اور جب تک اُس کے جسم و جان کا رشتہ منقطع نہیں ہوتا اُس کے قلب و دماغ میں ہمیشہ تحریک پیدا کرتے رہیں گے۔ ان سوالات کی نوعیت کوئی ذہنی ریاضت یا بازیگری کی نہیں بلکہ یہ فطرت انسانی کی اتھاہ گہرائیوں سے اُبھرتے ہیں، اور انسان سے ہر لمحہ اس امر کا مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ ان کا حل تلاش کرے۔ کیونکہ ان کا حل ڈھونڈنے سے ہی انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کا رُخ متعین ہوتا ہے اور علم و فلسفہ، تہذیب و شائستگی، معاشرت و معاملات، اخلاق و اجتماع، سیاست و آئین کی ایک خاص نہج پر تشکیل ہوتی ہے۔ تاریخ انسانی کا کوئی دور ایسا نہیں گزرا جس میں ان سوالات نے انسانوں کو اپنی طرف متوجہ کر کے اُن سے ان کے جوابات کا تقاضا نہیں کیا۔ پھر ان جوابات پر ہی مختلف انسانی فلسفے، تہذیبیں اور نظام ہائے حیات قائم ہوئے۔

ایک تہذیب کے مختلف مظاہر کے درمیان جو ہم آہنگی پائی جاتی ہے وہ بھی انسانی فطرت کے ان اساسی مطالبات کے بارے میں ایک خاص اندازِ فکر اختیار کرنے کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ اگر آپ ان کے جوابات دینے میں ایک خاص نقطہ نظر اختیار کریں گے تو یہ نقطہ نظر زندگی کے سارے گوشوں میں پوری آب و تاب سے نمایاں ہوگا۔ اور فکر و نظر کا یہ اتفاق و اتحاد ہی کسی تہذیب کے مختلف شعبوں کو ایک خاص رنگ میں رنگ کر اُن کے اندر وحدت پیدا کرے گا۔

آپ اسلامی تہذیب کو لیجئے اور دیکھئے کہ اس کے مختلف مظاہر کے اندر کتنی ہم آہنگی پائی جاتی

ہے۔ اس ہم آہنگی کی وجہ صرف یہی ہے کہ مسلمان خواہ کسی دور سے تعلق رکھتا ہو اُس نے انسان کے ان فطری سوالات کے جوابات دینے میں ایک خاص نہج اور انداز اختیار کیا ہے۔ اس کائنات کے آغاز و انجام کے متعلق اُس کا جواب یہ ہے کہ یہ کائنات کسی اتفاقی حادثہ کا نتیجہ نہیں۔ بلکہ ایک قادرِ مطلق ذات کی تدبیر کی کرشمہ سازی ہے۔ وہی ذات اس کائنات اور جو کچھ اس میں موجود ہے، اس کی تنہا خالق و مالک ہے اور کوئی دوسرا اس کے ساتھ شریک و سہیم نہیں ہو سکتا۔ اسی ذات نے اسے پوری حکمت و دانائی کے ساتھ وجود بخشا ہے۔ اور وہی ذات اپنے ارادہ و مشیّت کے تحت اُسے نیست و نابود کریگی۔ یہاں جو کچھ موجود ہے وہ اپنے بقا، نشو و نما کے لئے صرف اُسی قادرِ مطلق ذات کا رہینِ منت ہے۔ پوری کائنات میں صرف اُسی کا ارادہ کارفرما ہے۔ اور وہ با اختیار ہستی اس کائنات کو پیدا کر کے اس کی طرف سے غافل نہیں ہو گئی بلکہ اس کا ہر ذرّہ اُس کی نگاہ اور اختیار میں ہے۔ فکر و احساس، ارادہ و نیّت جیسی لطیف اور غیر مرئی لہروں سے لیکر بڑے سے بڑے سیاروں تک سب پر اُس کا بلا شرکت غیرے تسلّط و اقتدار قائم ہے۔ کسی کے اندر یہ ہمّت و طاقت نہیں کہ وہ اس کے حکم سے سرِمو بھی انحراف کر سکے۔

جہاں تک اس کائنات میں انسان کی حیثیت کا تعلق ہے اُس کے متعلق ایک مسلمان کے دل و دماغ میں یہ بات راسخ کی گئی ہے وہ اگرچہ مخلوق کی دوسری چیزوں کے مقابلے میں ممتاز ہے۔ لیکن اپنے خالق کے مقابلے میں وہ ایک عاجز اور بے بس بندہ ہے۔ جو اپنی زندگی، اور اپنی ساری جسمانی قوّتوں، اور فکری صلاحیتوں کے لئے اُسی قادرِ مطلق کا محتاج ہے جس کی یہ ساری کائنات دست نگر ہے۔ اُسے اگر ایک دائرہ عمل میں محدود اختیار سونپا گیا ہے تو یہ بھی اُسی خالق کی کرم فرمائی ہے تاکہ وہ اپنے ارادہ و اختیار سے اپنے معبود کے حضور میں اپنی عبودیت ثابت کر سکے۔ اور یہی وہ مقصد ہے جس کی تکمیل کے لئے اُسے پیدا کیا گیا ہے۔

فطرت کے بنیادی سوالات کے ان جوابات سے ہی وہ اساسی نقطہ نظر سامنے آتا ہے جس پر اسلامی تہذیب و تمدّن کی عظیم الشّان عمارت قائم ہوئی ہے اور اُس کے مختلف حصّوں کے درمیان ایک ربط و نظم ظاہر ہوتا ہے۔ یہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ اس تہذیب کا کوئی گوشہ اسلامی بھی کہلائے اور وہ اس نقطۂ نظر کے رُخِ زیبا کا عکس نہ ہو۔ (باقی)